حواشی

۱۔ متی ۵:۳۸ (نیو ریوائزڈ اسٹینڈرڈ ورژن [این آر ایس وی])۔ وہ دکھاتا ہے کہ کاتبوں کے عقیدے کے برعکس دوسری جدول کے مجموعے کو اس طرح سمجھا جانا چاہیے کہ برائی کا مقابلہ برائی سے کرنے کی کوشش دانش مندی نہیں بلکہ اس طرح دگنا نقصان ہوتا ہے۔ اس لیے ہمیں اپنے جانی دشمنوں کے ساتھ بھی بھلائی کرنی چاہیے۔

۲۔ چھٹا حکم، خروج ۲۰:۱۳، ''تو خون نہ کرنا۔''

۳۔ کنگ، ''کرسمس کا خطبہ ۱۹۶۷ء۔''

۴۔ پرابھو اینڈ راؤ، دی مائنڈ آف مہاتما گاندھی۔

۵۔ متی ۲۶:۵۱-۵۴ (این آر ایس وی)۔

۶۔ اس دلیل کی وضاحت میں نے تھیالوجی آف انگیجمنٹ کے چوتھے باب میں کی ہے۔

بین الاقوامی تعلقات کا اسلامی قانون:
بنیادیں اور آج کی دنیا سے تعلق

محمود احمد غازی

بین الاقوامی قانون کی بنیادیں

انسانی معاشروں خصوصاً بادشاہوں اور بادشاہتوں کے درمیان بین الاقوامی تعلقات کی ضابطہ بندی بالکل ابتداء ہی سے مشکل کام رہا ہے۔ زمانۂ قدیم سے قانون داں اور فلسفی ایسے قانونی اور اخلاقی اصول مرتب کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں جو انصاف اور پاکبازی کے اصولوں کے مطابق طاقت کے استعمال پر قابو رکھنے اور حکمرانوں اور ریاستوں کے درمیان تعلقات کی ضابطہ بندی کرنے میں مؤثر ہوسکیں۔ ان اصولوں کے علمبرداروں کے لیے ایک بڑا چیلنج ایسی معقول و منطقی بنیاد کو واضح کرنا تھا جس پر یہ قوانین تشکیل دیے جاسکیں۔ مؤرخین کے ریکارڈ کے مطابق اس ضمن میں کی گئی اولین کوششوں میں بین الاقوامی قانون کی یہ بنیاد قدیم مذاہب کے صحیفوں سے اخذ کی گئی تھی جن میں طاقت کے غلط استعمال پر بکثرت زجر و توبیخ کی گئی ہے۔ تاہم یہ اخلاقی پند و نصائح کسی قانونی نظم و ضبط یا بین الاقوامی فلسفہ قانون کی بنیاد نہیں بن سکتے۔

مغربی ماہرین قانون کی جانب سے قابل عمل اور منطقی بین الاقوامی قانون کو پروان چڑھانے کے لیے کی جانے والی کوششوں میں زیر بحث لائی گئی قدیم ترین بنیاد فطری قانون کا نظریہ تھا۔ اس نظریے نے - جو بین الاقوامی قانون کے لیے خدا، فطرت، آفاقی منطق اور خالص منطق کے ممکنہ بنیادیں اور ذرائع ہونے پر مبنی تھا - کئی صدیوں تک مغربی ماہرین قانون کو مشغول رکھا۔

یہ ''ذرائع'' قانون کو پیدا کرنے والے یا ایسے بنیادی ذرائع قرار دیے گئے جن سے تمام

قوانین اخذ کیے جانے چاہئیں۔ یہ قانون اُس چیز کی بنیاد پر متعین کیا جاسکتا تھا جسے درست دلیل اور سبب باور کیا جائے۔ اس طرح فطری قانون کے نظریے نے فرض کیا کہ بین الاقوامی قانون کی حتمی بنیاد کا آخری ذریعہ مابعد الطبیعاتی ہے۔

تاہم فطری قانون اپنی فلسفیانہ و علمی قدر و قیمت کے باوجود، بین الاقوامی مرتبے کے ایک متفقہ آفاقی قانون کو پروان چڑھانے میں ناکام رہا۔ اس کی ناکامی نے مثبت قانون کے نظریے کی راہ ہموار کی جو ریاستوں اور حکمرانوں کے حقیقی رویوں پر مبنی تھا۔ صرف قانون ہی نہیں بلکہ پوری اجتماعی زندگی کو مذاہب اور روحانی پوشاک سے الگ کر دینے کی انتھک کوششوں کے ساتھ یہ طرز فکر مغرب میں سیکولرازم کے ابھرتے ہوئے رجحان سے زیادہ مطابقت رکھتا تھا۔ مثبت قانون کا نظریہ اقدار سے آزاد تھا چنانچہ اس نے قانون کے اصولی و معیاری مفاہیم اور دوسرے سماجی ضابطوں کو مسترد کر دیا۔ اس نے خدا، اخلاقیات اور دلیل و معقولیت جیسی قانون کی کسی غیر ریاستی اساس کو قبول کرنے سے بھی انکار کیا۔[1]

ان علمی کاوشوں کے باوجود، مثبت قانون کے نظریے کے بیشتر علم بردار ایسے قانون کو پروان چڑھانے کے معاملے میں انسانی صلاحیت سے مایوس اور غیر مطمئن نظر آئے۔ ایک قدیم رومن حکمراں کا قول ہے کہ ہتھیاروں کی معیت میں قوانین ناکام ہو جاتے ہیں یا کم از کم خاموش رہتے ہیں۔ تاریخ بھی یہی بتاتی ہے کہ ہتھیاروں کے کھیل کے دوران قوانین یا تو ناکام ہو جاتے ہیں یا منظر سے ہٹ جانے کی راہ اپناتے ہیں۔ اس رومن حکمراں نے بہت پہلے اس حقیقت کی نشان دہی کر دی تھی کہ ماضی میں ریاستوں کے مابین تعلقات کو منضبط کرنے اور طاقت کے استعمال سے بچنے کے لیے مختلف معاشروں اور تہذیبوں کی جانب سے کیے گئے تجربات بری طرح ناکام ہوتے رہے ہیں۔ ان ناکامیوں اور ان سے نمٹنے میں درپیش مشکلات کے باوجود، انسانی تعلقات کو منضبط کرنے کے لیے کی جانے والی کوششیں، خصوصاً جنگ جیسے حالات میں، شاید اتنی ہی پرانی ہیں جتنا خود انسانی معاشرہ۔

تاریخ کے ریکارڈ کے مطابق ایسی پہلی کاوش میسوپوٹیمیا میں لگ بھگ دو ہزار قبل مسیح میں کی گئی

تھی۔اس کی کچھ تفصیلات ہم تک پہنچی ہیں۔یہ علاقے کی دو بڑی طاقتوں کے درمیان ہونے والا ایک سمجھوتہ تھا جس میں باہمی طور پر طے کیا گیا تھا کہ سرحدی قضیوں اور دوسرے باہمی اور دوطرفہ مسائل کو بات چیت اور پرامن ذرائع سے حل کیا جائے گا۔اس دستاویز کو بجا طور پر بین الاقوامی تنازعات کے حل کے نقطہ نظر سے کیا گیا قدیم ترین سمجھوتہ یا معاہدہ تصور کیا جاسکتا ہے۔

اس ضمن میں ہندی اور چینی فلسفیوں اور مفکرین کی کاوشیں بھی اہم ہیں۔انہوں نے ایسے قوانین اور اصول وضع کرنے کی کوششیں کیں جو بین الاقوامی تعلقات کو منضبط کرنے کی بنیاد بن سکیں۔[۲]

ان نسبتاً ترقی یافتہ معاشروں کے ساتھ ساتھ، زمانہ قدیم میں، خودمختار بادشاہوں اور عوام کے درمیان تعلقات کو منضبط کرنے کے طریق کار کے قواعد موجود تھے جوان کے اپنے استعمال اور تجربات سے وجود میں آئے تھے۔عیسائیت کے آغاز سے صدیوں پہلے مصری ایسے متعین قواعد وضوابط سے واقف تھے[۳]۔

ان منتشر مثالوں کے علاوہ، مشرق اور مغرب دونوں میں، یونانیوں اور رومیوں کی جانب سے ایسے قانون کی تیاری کی کوششیں کی گئیں جو مسلح تنازع کے دوران طاقت کے استعمال کو منضبط کرسکے۔ مثلاً رومیوں نے اس مقصد کے لیے جو قانون بنایا وہ *Jus Gentium* یعنی عوام کا قانون کہلاتا تھا۔[۴] دوسرے معاشروں میں بھی باہمی تنازعات اور اختلافات کے تصفیہ کی بنیاد فراہم کرنے کے لیے ایسے ہی قوانین موجود تھے۔

مغرب میں جدید بین الاقوامی قانون کا ارتقاء

سترھویں صدی کے قریب، مغربی تہذیب بالآخر ایسے قانون کی بنیاد ڈالنے کے قابل ہوگئی جسے فی الواقع بین الاقوامی قانون کے طور پر جانا جاسکے۔بین الاقوامی قانون کی اس اساس میں رسوم و رواج، معاہدوں، اور عملاً بین الاقوامی اداروں کی طرف سے قانون سازی کی ایسی ہی کوششوں کی وجہ

سے تیز رفتار تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اس پیش رفت پر کوئی تفصیلی بحث اصل موضوع سے ہماری توجہ ہٹادے گی۔ تاہم یہاں یہ کہنا کافی ہوگا کہ جدید بین الاقوامی قانون کا مقصد ابتداً یورپ کی عیسائی ریاستوں کے باہمی تعلقات کو منضبط کرنا تھا، اور یہ قومیں صرف اپنے باہمی تعلقات میں خود کو اس کا مکلّف سمجھتی تھیں۔ غیر عیسائی ایک مدت تک اس قانون کے تحت کسی فائدے یا مراعات کے مستحق تصور نہیں کیے جاتے تھے۔ اس لیے بین الاقوامی قانون مغرب میں جس طرح پروان چڑھا، وہ اپنی تعریف کی رو سے، ایک عیسائی قانون ہے۔ فی الحقیقت یہ تعریف بین الاقوامی قانون کی کئی معیاری نصابی کتابوں میں دی گئی ہے۔ ان میں پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے تعلیمی اداروں سمیت عالمی سطح پر تقریباً تمام ایسی ممتاز جامعات اور لاء اسکولوں میں جہاں اینگلو سیکسن قانونی روایت کی تدریس ہوتی ہے، پڑھائی جانے والی اوپن ہیم ۵ کی شاہکار تصنیف بھی شامل ہے۔

بین الاقوامی قانون کے اس پہلو کی مختلف لوگوں نے مختلف طور پر تعبیر کی ہے۔ زیادہ متشدد نقطہ ہائے نظر میں، پوپ کی جانب سے مختلف اوقات میں جاری کیے جانے والے کم از کم دو فرامین شامل ہیں جن میں قرار دیا گیا تھا کہ عیسائی دنیا کو مذہباً کسی مسلم ملک کے ساتھ کسی پرامن معاہدے میں شامل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ [۶] پوپ نکولس چہارم اور پوپ اربن ششم نے اعلان کیا تھا کہ کسی غیر عیسائی ریاست کے ساتھ کیا گیا ہر معاہدہ لغو اور باطل ہے اور عیسائی، مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے کسی معاہدے کے پابند نہیں ہیں۔ [۷] جب پوپ صاحبان نے یہ حکم جاری کیا تو غالباً ان کے دماغ میں سلطنت عثمانیہ کا خیال تھا۔ یہ ۱۸۵۶ء کا ترکی تھا جسے یورپ کے بین الاقوامی قانون کی تاریخ میں پہلی بار متعلقہ مراعات سے استفادے کے حق کے ساتھ بین الاقوامی برادری کا رکن تسلیم کیا گیا۔ ترکی کے بعد جاپان کو ۱۹۰۵ء میں یہ مرتبہ دیا گیا۔ مغربی بین الاقوامی قانون کئی عبوری ادوار سے گزرا ہے۔ یورپی اقوام اور ممالک ابتداء میں صرف اپنے اپنے براعظموں میں اپنی مذہبی روایت کے مطابق تعلقات کو منضبط کرنے سے سروکار رکھتے تھے۔ مغرب میں اس وقت تک اس قانون کو دوسری تہذیبوں اور ملکوں تک وسیع کرنے کا عمل شروع نہیں ہوا تھا۔ جب اس قانون کا دائرہ اطلاق وسیع ہو گیا تو یورپ

کے سابقہ رویے میں یقینی طور پر زیادہ معروضیت اور توازن پیدا ہوا۔ تاہم یہ بات مانی جانی چاہیے کہ اس پرانے رویے کے اثرات ان میں سے بعض عناصر کی سوچ میں اب بھی پیوست ہیں جو آج بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی امور سے متعلق معاملات طے کرتے ہیں۔ یہ رویہ مسلمانوں کو اذیت دیتا ہے جو اکثر اس کے ہاتھوں زخم کھاتے ہیں۔ اس رویے کے نتیجے میں انہیں وہ حقوق اور مراعات پوری طرح دینے سے انکار کیا جاتا ہے جن کی ضمانت انہیں بین الاقوامی قانون کے مختلف پہلوؤں کے تحت دی گئی ہے۔ اس طرح انہیں یہ سمجھنے پر مجبور کیا جاتا ہے کہ ان کے ساتھ اب بھی بین الاقوامی برادری کے مساوی رکن کا سا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ مغرب میں بین الاقوامی قانون جس طرح پروان چڑھا، یہ کیفیت اس کا فطری نتیجہ ہے۔

مغربی بین الاقوامی قانون کو مختلف ملکوں کے بلدیاتی قانون سے کچھ مختلف چیز سمجھا گیا۔ چنانچہ ایک مدت تک یہ صرف ریاستوں سے معاملات تک محدود رہا۔ بین الاقوامی تنظیموں اور بین الاقوامی اداروں کو بین الاقوامی قانون کا موضوع تسلیم کیے جانے کا مرحلہ بہت دیر بعد بیسویں صدی کے وسط میں آیا۔

بین الاقوامی قانون کے تحت افراد کے ان گروپوں اور جماعتوں کی جانب متوجہ ہونے کی نوبت اور بھی بعد میں آئی جو کسی ریاست کی نمائندگی نہیں کرتیں یا جنہیں کسی ریاست کی جانب سے نمائندگی نہیں دی گئی تھی۔[۸] فی الحقیقت افراد اور جماعتوں کے معاملے کا بین الاقوامی قانون کا موضوع تسلیم کیا جانا بہت تازہ بات ہے جسے شاید تین عشروں سے زیادہ نہیں ہوئے۔ باغی، جنگجو اور ایسے ہی دیگر عناصر جو کسی ملک کی اصل آبادی سے الگ ظاہر ہو سکتے ہیں، ابتداء میں بین الاقوامی قانون کا موضوع تصور نہیں کیے جاتے تھے[۹]۔ تاہم اب وہ ایک اہم موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح قومی آزادی کی تحریکوں کو بھی بین الاقوامی قانون کی دلچسپی کا موضوع سمجھے جانے میں ایک لمبی مدت لگی۔ آزادی کی تحریکوں کی اقوام متحدہ کی کسی رکن ریاست کی جانب سے نمائندگی نہیں کی جاتی تھی۔ اس لیے نہ تو انہیں زیر غور لانے کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی، نہ بین الاقوامی قانون کا خود اپنا

ڈھانچہ انہیں، ایک موضوع کی حیثیت سے، کوئی حقوق یا مراعات فراہم کرنے کے قابل تھا۔[۱۰]

بیسویں صدی کے دوسرے نصف نے بین الاقوامی قانون اور مغربی دنیا کی قانون سے متعلق سوچ میں ایک بڑی تبدیلی دیکھی۔ دوسری عالمی جنگ کے خوفناک تجربے نے عالمی برادری کو اس نتیجے پر پہنچایا کہ مسلح تنازعات سے متاثر ہونے والے معصوم شہریوں کے مفادات اور دفاع کو محفوظ بنانے کے لیے بین الاقوامی قانون کی نئی جہتیں تلاش کی جانی چاہئیں۔ پچھلے چند عشروں پر مشتمل اس دور نے سائنس اور بین الاقوامی قانون میں توسیع اور تعمق کا غیر معمولی عمل دیکھا جس نے نئے میدانوں اور نئے موضوعات کو بین الاقوامی قانون میں داخل کیا۔ ان میں سے بیشتر پیش رفت کا تذکرہ، بین الاقوامی قانون پر کی گئی کلاسیکی کاوشوں میں نہیں ملتا۔

بین الاقوامی قانون کے نئے شعبوں میں سے چند یہ ہیں: خلاء کے معاملات کی ضابطہ کاری، گہرے پانیوں کے ٹھکانوں کا استعمال اور تقسیم، بین الاقوامی مالیاتی نظام کا بندوبست اور بین الاقوامی مواصلات۔ لیکن بین الاقوامی قانون سازی کا علم قانون میں اپنی جگہ بنانے والا سب سے اہم شعبہ، جو اپنے فوائد کو لوگوں کی بہت بڑی تعداد تک پہلے ہی وسعت دے چکا ہے، انسانی حقوق کا بین الاقوامی قانون ہے۔

انسانی حقوق کا موضوع بیسویں صدی کے آغاز تک دنیا کے بہت سے دساتیر میں شامل نہیں تھا۔ تاہم بہت مدت پہلے ایک وقت آیا جب انسانی حقوق کے سوال نے قانونی سوچ کے تناظر، بالخصوص دستوری قانون کے میدان میں اولین اہمیت حاصل کر لی۔ جلد ہی اس کی تقلید بین الاقوامی قانون میں بھی ایسی ہی پیش رفت کے ذریعے کی گئی۔

یہ بات لازماً تسلیم کی جانی چاہیے کہ ان اختراعی اور مثبت تبدیلیوں کا سہرا مغربی روایت کے سر ہے، جس نے اپنے شہریوں کو دستوری ضمانتیں مہیا کرنے میں پیش قدمی کی۔ یہ اعتراف بھی کیا جانا چاہیے کہ بنیادی حقوق کا سوال، قانون کی حکمرانی کا تصور، آئینی ذرائع پر مبنی بنیادی حقوق کے دفاع کا نظام، اور شہریوں کے حقوق کے دفاع و تحفظ کے لیے ایک اعلیٰ ترین عدالت کی موجودگی کا خیال، ان

پر جس طرح بعض جدید مسلم ملکوں میں عمل ہو رہا ہے، وہ، مغرب خصوصاً امریکی تجربے کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے امریکی مصنفوں نے فخر کے ساتھ اور بجا طور پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ امریکی آئینی روایات اور اصول، امریکہ کی اہم ترین برآمد ہیں۔ بیس سال پہلے تک امریکی اس دعوے میں حق بجانب تھے۔ تاہم بدقسمتی سے پچھلی ربع صدی میں امریکہ کی پالیسیاں، بالخصوص جن کا تعلق مسلم دنیا سے ہے، ایسی رہی ہیں کہ امریکی یہ دعویٰ کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہے۔

بین الاقوامی قانون کے بعض مغربی فضلاء بین الاقوامی قانون کے دائرے میں انسانی حقوق کی شمولیت کو بہت بڑا کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ مارٹن ڈکسن اسے ایک قابل لحاظ کامیابی تصور کرتے ہیں کہ اب فرد بھی بین الاقوامی قانون کے دائرہ اختیار میں شمار کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ اس صورت میں بھی جب اس اعتراف کا کوئی اثر عملی طور پر نظر نہ آتا ہو۔[11]

انسانی حقوق کے باب میں یہ ایک نیا رجحان ہے جس کے سبب یہ بین الاقوامی قانون کا اہم ترین نہیں تو ایک نہایت اہم جزو ضرور بن گیا ہے[12]۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے کی تحریری کاوشوں میں انسانی حقوق کا مشکل ہی سے کوئی ذکر ملتا ہے۔ اس دور کی کتابوں میں نہ صرف یہ کہ اس معاملے کا کوئی تذکرہ نہیں پایا جاتا بلکہ بیسویں صدی کے وسط سے پہلے تک بین الاقوامی قانون سے متعلق ادارے بھی فرد کے انسانی حقوق کی پامالی پر کوئی توجہ دینے سے انکار کیا کرتے تھے۔ مثلاً ۱۹۲۷ء میں بخوبی معروف لوٹس کیس میں بین الاقوامی انصاف کی مستقل عدالت نے فیصلہ سنایا تھا کہ ''بین الاقوامی قانون خودمختار ریاستوں کے روابط سے متعلق ہے۔''[13]

دوسری عالمی جنگ کے خوفناک تجربے کے نتائج وعواقب کی بناء پر اس سوچ میں تبدیلی آئی اور اس نے لوگوں کو، انسانی حقوق کے معاملے کو بین الاقوامی قانون کی ایک اہم شاخ کی حیثیت دینے کی راہ دکھائی۔ اقوام متحدہ اور اس کے ذیلی اداروں نے بین الاقوامی علم قانون کو یہ نئی سمت دینے میں زبردست کردار ادا کیا۔ آج انسانی حقوق کا سوال بین الاقوامی تعلقات میں ایک اہم عنصر سمجھا جاتا ہے۔ متعدد مغربی ملکوں نے انسانی حقوق کی حمایت، تحفظ اور دفاع کے مقصد کو اپنی خارجہ پالیسی اور

بین الاقوامی تعلقات کے سنگ بنیاد کی حیثیت سے اختیار کیا ہے۔

یہاں اس بات کی نشان دہی مناسب ہوگی کہ مغربی دنیا میں جو کچھ دو عالمی جنگوں کے خوفناک تجربات کے بعد حاصل کیا گیا- یعنی افراد اور غیر ریاستی عناصر کے بین الاقوامی قانون کا موضوع ہونے کو تسلیم کیا جانا، اور ان لوگوں کے بنیادی انسانی حقوق کا لحاظ جو جنگوں سے متاثر ہوئے ہوں- وہ مسلم بین الاقوامی قانون کا بالکل ابتداء ہی سے ایک اہم موضوع رہا تھا۔ اس کی وضاحت اس مقالے کے دوسرے حصے میں کی گئی ہے۔

انسانی حقوق کے قانون کا ایک کلیدی ماخذ بین الاقوامی سمجھوتے ہیں۔ تاہم اب بالعموم تسلیم کیا جاتا ہے کہ بین الاقوامی تعلقات کا قانون، خصوصاً جہاں تک وہ انسانی حقوق سے متعلق ہے، اس کی اصل بنیاد ریاست کی معاہداتی ذمہ داریوں پر ہے۔ بہرکیف بین الاقوامی معاہدے اور ریاست کی معاہداتی ذمہ داریاں صرف رسمی ماخذ ہیں۔ اور کسی بھی طرح بین الاقوامی قانون کی اس شاخ کے تقدس اور اہمیت کا واحد سبب نہیں ہیں۔ فی الحقیقت سب سے پہلے یہ عدل وانصاف کے لیے لوگوں کے دل و دماغ میں پایا جانے والا تقاضا اور انسان کے وقار واحترام پر ان کا عقیدہ ہے جو ان حقوق کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اگر انسانوں کی عزت اور وقار کا احساس لوگوں کے دل و دماغ میں گہرے طور پر پیوست نہ ہوتا تو محض معاہداتی ذمہ داریاں ہرگز نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی تھیں۔ یہ حقیقت پچھلے دو عشروں کے تجربات سے بخوبی واضح ہوچکی ہے۔ فلسطین، بوسنیا اور کشمیر اور حال ہی میں گوانتانا موبے جیسے علاقوں میں انسانی حقوق کی پامالی کی مثالیں اتنی معروف ہیں کہ انہیں نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

افراد کے حقوق اور مراعات کے لیے مغربی قانون بین الاقوام اور علم قانون کی کاوشوں نے بین الاقوامی قانون کی ایک نئی شاخ کی راہ ہموار کی جو بین الاقوامی انسان دوست قانون کے طور پر معروف ہے۔ بین الاقوامی قانون کی یہ خصوصی شاخ جنگ کے دوران غیر متحارب شہریوں کے گروپوں کے انفرادی اور اجتماعی حقوق کے تحفظ کی کوشش کرتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ کسی بھی بنیاد پر ہونے والی نسل کشی اور امتیازی سلوک کو روکنے کی جدوجہد کرتی اور اقلیتوں کو خصوصی تحفظات مہیا کرتی ہے۔ ''انسانی

حقوق کا قانون'' بین الاقوامی قانون کے ایک مصنف کے بقول'' تنہا بین الاقوامی قانون کی روایتی مثبت اپروچ کے حوالے سے واضح نہیں کیا جاسکتا۔''[۱۴] اس بیان کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ روایتی مغربی قانون بین الاقوام، ان اہم امور سے نمٹنے میں غیر مؤثر رہا ہے، اور اب بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی اداروں کی پہلی ترجیح انسانوں کے حقوق اور مراعات کے تحفظ کو حاصل ہونی چاہیے۔ بین الاقوامی قانون کو اب روایتی مثبت اپروچ اور اس کے محدود اور تنگ تناظر سے بالاتر ہوجانا چاہیے۔

بین الاقوامی انسان دوست قانون جو بین الاقوامی قانون کی نئی شاخ ہے - بین الاقوامی تنازعات میں ان لوگوں کو تحفظ فراہم کرکے جو دشمنیوں میں براہ راست شریک نہیں ہوتے یا شریک نہیں رہتے، دوسرے یہ کہ تشدد کو مقصد کے حصول کے لیے کم سے کم سطح پر رکھنے کی کوشش کرکے - حتی الامکان تشدد کے دائرے کو پھیلنے سے روکتا ہے۔ یہ قانون مطالبہ کرتا ہے کہ کسی بھی تنازع کا مقصد دشمن کی صرف فوجی صلاحیت کو کمزور کرنا ہونا چاہیے نہ کہ اسے مکمل اور طبعی طور پر ختم کردینا۔

انسان دوست قانون کے بنیادی اصول یہ ہیں:

- شہریوں اور جنگجوؤں میں امتیاز،
- ان جنگجوؤں پر حملہ کرنے کی ممانعت جو شریک جنگ نہ رہیں،
- لوگوں کو غیر ضروری مشکلات میں مبتلا کرنے کی ممانعت،
- قانون ضرورت،
- قانون تناسب۔[۱۵]

ان نکات کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ انسان دوست قانون کے پانچ بنیادی اصول ہوں گے جسے مغربی دنیا میں تشکیل دیا جارہا ہے۔ یہ قانون فرض کرتا ہے کہ تنازعات سے پاک دنیا کا کوئی وجود نہیں ہے، اس لیے یہ تشدد کے مکمل خاتمے کو اپنا مقصود نہیں بناتا۔ دو قوموں یا ملکوں کے درمیان مسلح تنازع سے متاثر ہونے والوں کو مکمل تحفظ فراہم کرنے کی یہ قانون کوشش نہیں کرتا۔ یہ تنازع میں

متحارب قوتوں کے اغراض و مقاصد اور محرکات کے جائز و ناجائز ہونے کی بنیاد پر ان کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتا اور اخلاقی محرکات اور غیر اخلاقی محرکات دونوں کی بنیاد پر جنگ کرنے والوں کو عملاً مساوی درجہ دیتا ہے۔ یہ قانون پہلے ہی سے تصور یا فرض کر لیتا ہے کہ فریقین جنگ شروع کرنے کی معقول بنیاد رکھتے ہیں۔

یہ ہے وہ علمی سیاق و سباق جس میں ہم بین الاقوامی قانون میں مسلمانوں کے کام پر بات کریں گے۔

مسلم بین الاقوامی قانون

اسلام اپنے پیغام اور طرز فکر میں بین الاقوامی ہی نہیں، آفاقی بھی ہے اور امت مسلمہ بالکل شروع ہی سے اپنا آفاقی کردار ادا کرتی رہی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اسلام کی طرف بالکل ابتداء میں دی گئی دعوت ہی میں لوگوں کے کسی مخصوص گروہ کو خطاب کرنے کے بجائے پوری انسانیت کو مخاطب کیا گیا تھا۔ قرآن، یا ارشادات نبویؐ میں ہم کہیں نہیں دیکھتے کہ خصوصی طور پر عربوں، ایرانیوں یا دوسرے نسلی یا لسانی گروہوں کو مخاطب کیا گیا ہو۔ اس کے بجائے لوگوں کو ''یا ایھا الناس''[16] یا ''یا بنی آدم''[17] کے الفاظ سے مخاطب کیا گیا ہے۔ قرآن کی بہت سی آیات اور اہم مباحث کا آغاز ان میں سے کسی فقرے سے ہوتا ہے، خاص طور پر مکی سورتوں میں۔ اس پتہ چلتا ہے کہ بعض مغربی مصنفین کے خیال کے برعکس قرآن کا طرز فکر اور پیغام، مکے میں سلسلۂ وحی کی ابتداء ہی سے، آفاقی اور انسانی اتحاد کی دعوت پر مبنی ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں، خاص طور پر چند مغربی ذہنوں میں، ایک غلط فہمی یہ ہے کہ یہ ایک یک طرفہ نظام پیش کرتا ہے جس میں اسے نہ ماننے والوں کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا جاتا۔ نیز یہ نظام اپنے دائرے سے باہر کسی تہذیبی معیار یا ثقافتی قدر کو قبول نہیں کرتا۔ یہ خیال درست نہیں۔ قرآن خود بارہا نہایت مؤثر انداز میں دوسری قوموں کی اچھی صفات کی طرف توجہ دلاتا ہے۔[18] دوسروں کی

خوبیوں کے اعتراف کی عملی مثالیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں موجود ہیں، مثلاً یہ کہ آپؐ نے فرمایا کہ حکمت و دانش پوری انسانیت کی مشترکہ میراث ہے، لہٰذا جہاں بھی یہ ملے اس سے استفادہ کیا جانا چاہیے۔[19]

یہ چیز پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں بھی پوری طرح منعکس ہوئی۔ اپنی عمر کی تیسری دہائی کے اوائل میں، ایک نوجوان کی حیثیت سے، انہوں نے اپنے خاندان کے بزرگوں کے ساتھ مل کر ایک اتحاد کی بنیاد ڈالی، جس کا مقصد غریبوں کو تحفظ، زیادتی کا شکار ہونے والوں کو انصاف، بے گھر افراد کو سر چھپانے کا ٹھکانا اور کمزوروں کو امداد فراہم کرنا تھا۔ عملی طور پر یہ کوئی نسلی یا محدود اتحاد نہیں تھا بلکہ اس کے منافع، قبائلی اور دیگر امتیازات سے بالاتر اور سب کے لیے عام تھے[20]۔ اسلامی تاریخ میں یہ اتحاد حلف الفضول کے نام سے معروف ہے۔ یہ اتحاد ہجرت نبویؐ سے تین عشرے سے زیادہ مدت پہلے عمل میں آیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اعلان نبوت کے بعد لوگوں نے محسوس کیا کہ آپؐ کی تعلیمات ان اصولوں ہی جیسی ہیں جن پر یہ اتحاد قائم ہوا تھا تو انہوں نے آپؐ سے اس اتحاد کے بارے میں سوال کیا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ وہ اب بھی اس اتحاد کی خوشگوار یادوں سے محظوظ ہوتے ہیں اور اسلام کی آمد کے بعد بھی اگر انہیں ایسے کسی اتحاد میں شرکت کی دعوت دی گئی تو وہ بلا تاخیر اس پر لبیک کہیں گے۔ آپؐ نے مزید فرمایا کہ ایسے اتحاد میں شریک ہونے کو وہ سرخ اونٹوں (یعنی بدویوں کے نزدیک بہترین دنیاوی ساز و سامان) سے بہتر تصور کرتے ہیں۔[21] پیغمبر اسلام کا یہ رویہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ سچے مسلمان انسانی حقوق کے حوالے سے بین الاقوامی کوششوں میں تعاون کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔

اگر ایک منصفانہ اور روادار عالمی معاشرے کے قیام کے لیے اسلام کی نمایاں دلچسپی اور اختلاف و تنوع کے لیے اس کی جانب سے احترام کے حوالے سے کچھ شبہات باقی ہوں تو قرآن کا مطالعہ انہیں پوری طرح رفع کر دیتا ہے۔ متعدد دوسری متعلقہ آیات کے ساتھ ساتھ قرآن تمام اہل کتاب[22] کو یوں خطاب کرتا ہے: ''اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان

یکساں ہے، یعنی یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔''[۲۳] یوں اس آیت میں دراصل انسانی آزادی و مساوات اور ان اخلاقی معیارات کے فروغ کے لیے باہمی تعاون کی بات کی گئی ہے جو ہمارے درمیان مشترک ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اہل کتاب کو قرآن اور مسلم دنیا نے یہ دعوت ۱۴۲۰ سال پہلے دی تھی، جبکہ اس کا جواب ابھی تک نہیں ملا ہے۔

انسانیت کی بہتری کے لیے پوری انسانی برادری کے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے کی قرآن اور رسول اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے یہی حوصلہ افزائی ہے جس کی بناء پر مسلم ممالک - اقوام متحدہ، اس سے پہلے بننے والی مجلس اقوام، افریقی اتحاد کی تنظیم، اور غیر جانبدار ملکوں کی تحریک جیسے بین الاقوامی معاہدوں اور تنظیموں میں شامل ہونے میں کسی ہچکچاہٹ کا شکار نہیں ہوئے۔ اور اسی وجہ سے مسلم ممالک آج متعدد بین الاقوامی فورموں میں سرگرمی سے حصہ لیتے نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ مسلم ذہن مشترکہ بین الاقوامی مقاصد کو آگے بڑھانے اور بحیثیت مجموعی انسانیت کی خدمت کی خاطر دوسروں کے ساتھ تعاون کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔

اسلام نہ صرف قوموں کے تنوع کا احترام کرتا ہے بلکہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے مذہبی عقائد اور نظریات اس کے ساتھ شانہ بشانہ موجود ہیں۔ جدید مسلمان ماہرین قانون نے اس پہلو پر خصوصی توجہ دی ہے۔[۲۴] مذاہب کی تاریخ میں شاید قرآن وہ واحد آسمانی کتاب ہے جس نے دوسرے مذاہب کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ یہ اہل کتاب، عیسائیوں، یہودیوں، صابئین، بت پرستوں اور ملحدوں سمیت سب کو مخاطب کرتا ہے۔[۲۵] قرآن اس بارے میں مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے کہ دیگر عقائد کے ماننے والوں میں سے جو ان کے ساتھ کسی معاہدے میں شریک ہوں، جو ہر قسم کے تعلق سے دور رہنے کو ترجیح دیں، جو غیر جانبدار رہنا چاہیں، اور جو دشمنی کا رشتہ استوار کرنے کے خواہش مند ہوں، ان سے کس طرح کا برتاؤ کرنا ہے۔[۲۶] یہ حقیقت کہ ان تمام اقسام کی وضاحت اور مسلمانوں کے لیے ان میں سے ہر ایک سے برتاؤ کے اعلیٰ اخلاقی معیارات کی صراحت، قرآن میں کی گئی ہے، ظاہر کرتی

ہے کہ قرآن نہ صرف یہ کہ بین الاقوامی روابط کی رنگارنگی کو ملحوظ رکھتا ہے بلکہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان باہمی میل جول اور قربت کی ممکنہ راہیں بھی تلاش کرتا ہے۔

اس ربط وضبط کی عملی تفصیلات کا مظاہرہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسوۂ حسنہ کے ذریعے کیا۔[۲۷] دوسری صدی ہجری کے مسلمان علماء اور فقہاء نے سِیَرْ کے نام سے قرآن اور سنت کی بنیاد پر ایک آزاد تاریخی قانونی ضابطہ مدون کیا جس میں رسول اللہ کے ان غزوات اور دیگر معرکوں سے مدد لی گئی جن میں آپ نے خود شرکت فرمائی تھی، جلد ہی سیر بین الاقوامی تعلقات کو منضبط کرنے کے والے مجموعہ قوانین کی شکل میں ڈھل گیا۔ دوسری صدی ہجری کے مسلمان فقہاء کی یہ مشق ایسی بہت سی کاوشوں کا ذریعہ بنی جن میں شریعت کے اس حصے کی ضابطہ کاری کی گئی جو غیر مسلم ہم عصروں کے ساتھ مسلمانوں کے روابط وتعلقات سے بحث کرتا ہے۔[۲۸] ان کاوشوں میں سے تقریباً ایک درجن مکمل یا جزوی طور پر ہم تک پہنچی ہیں۔[۲۹] ان میں سے تین جنہیں امام ابوحنیفہ (وفات ۱۵۰ھ) کے شاگرد امام محمد ابن حسن شیبانی (وفات ۱۸۹ھ) نے تحریر کیا، خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ شیبانی نے پہلے نسبتاً ایک مختصر کتاب لکھی جسے انہوں نے کتاب السیر الصغیر (یعنی بین الاقوامی قانون کی مختصر کتاب) کا نام دیا۔ بعد میں انہوں نے ایک زیادہ جامع کتاب تحریر کی جس کا نام انہوں نے کتاب السیر الکبیر (یعنی بین الاقوامی قانون کی بڑی کتاب) رکھا۔ اپنی زندگی کے آخری حصے میں شاید انہوں نے محسوس کیا کہ عام طالب علم کے لیے پہلی کتاب بہت مختصر اور دوسری کتاب بہت مفصل ہے، لہٰذا عام قارئین کے خیال سے ایک اور کتاب کی تیاری شروع کی۔ مگر لگتا ہے کہ یا تو وہ اس کام کو مکمل نہیں کر سکے یا وہ ہم تک پہنچا نہیں۔ اس کتاب کا ایک نامکمل مسودہ ترکی کے شہر استنبول کی سلیمانیہ لائبریری میں محفوظ ہے۔[۳۰] ہم پوری ذمہ داری سے کہہ سکتے ہیں کہ شیبانی انسانی تاریخ میں وہ پہلا ماہر قانون ہے جس نے بین الاقوامی قانون پر، دیگر قانونی افکار اور ان کی عملی کارکردگی کی دوسری شاخوں سے ممتاز اور جداگانہ موضوع کی حیثیت سے، تین ایسی کتابیں لکھیں جو آج بھی موجود ہیں۔

مغرب میں ولندیزی قانون داں ہیوگو گروشس (م ۱۶۴۵ء) کو بین الاقوامی قانون کا باوا آدم

سمجھا جاتا ہے۔ یہ پہلا مغربی قانون داں ہے جس نے ولندیزی زبان میں قانون جنگ و امن کے موضوع پر ہمارے لیے ایک کتاب چھوڑی ہے۔ تاہم اس عظیم ماہر قانون کی ولادت سے ۸۶۶ برس پہلے امام محمد ابن حسن الشیبانی عربی زبان میں سیر کے موضوع پر تین کتابیں لکھ چکے تھے جن میں انہوں نے اس حوالے سے کہ غیر مسلم اجتماعیّتوں اور ملکوں سے اسلامی ریاست کے تعلقات کس طرح منضبط کیے جانے چاہئیں، خود اپنی، اپنے استاد امام ابوحنیفہ اور دوسرے ہم عصر فقہاء کی تحقیقات اور فیصلوں کو مدوّن کیا تھا۔

دوسری صدی ہجری کے مسلمان ماہرین قانون کی جانب سے سیر کے علم کو جس طرح پروان چڑھایا گیا وہ صرف ریاستوں اور اجتماعیّتوں سے بحث نہیں کرتا بلکہ افراد کے حقوق کو بھی ملحوظ رکھتا ہے، مثلاً اس میں بتایا گیا ہے کہ غیر مسلم ماحول میں رہنے والے مسلمان اور مسلم ماحول میں بسنے والے غیر مسلم کے حقوق کیا ہیں۔ واضح رہے کہ جدید بین الاقوامی قانون نے افراد اور اجتماعیّتوں پر گزشتہ چوتھائی صدی سے پہلے تک کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ بہرکیف، شیبانی اور ان کے ہم عصر ماہرین قانون کی تحریروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے بالکل ابتداء ہی سے، افراد اور اجتماعیّتوں کو بین الاقوامی قانون کے موضوع کی حیثیت سے تسلیم کیا۔ انہوں نے دشمن ملک کے افراد کے ساتھ ساتھ ان مسلمان شہریوں کے حقوق و مراعات کی وضاحت بھی کی ہے جو دشمن کے علاقے کے دورے پر گئے ہوں۔

مارٹن ڈکسن نے پانچ اصول مقرر کیے ہیں جن کی بنیاد پر کسی بین الاقوامی قانون کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بقول بین الاقوامی قانون کا پہلا کام جنگ کو روکنا اور طاقت کے استعمال کو کنٹرول کرنا ہے۔ اگر کوئی قانون اس مقصد کے حصول میں ناکام رہے تو وہ ایک ناکام قانون ہے۔ مارٹن ڈکسن کے پانچ اصول یہ ہیں:

۱) جنگ کو روکنا،

۲) تنازع کو مفاہمت کے ذریعے پرامن طور پر طے کرنا،

۳) جنگ کو کم سے کم سطح تک محدود رکھنا،

۴) جنگ کے اثرات کو محدود رکھنا، اور

۵) جنگ کے متاثرین کا تحفظ کرنا۔[۳۱]

یہ تمام معیارات قرآن اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں موجود ہیں اور مسلمان ماہرین قانون کی جانب سے انہیں مزید واضح کر دیا گیا ہے۔[۳۲]

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بین الاقوامی قانون کی صحت و درستگی کا سوال، جو مغرب میں اب تک حل نہیں ہو سکا، اسلام کے بین الاقوامی قانون میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتا۔ ہیوگو گروشس کے دور سے بیسویں صدی کے وسط تک، مغرب میں بین الاقوامی ضابطہ قانون کے قانونی کردار پر گرما گرم بحث جاری رہی۔ بعض فضلاء اور قانون دانوں کا کہنا تھا کہ بین الاقوامی قانون، حقیقی معنوں میں قانون نہیں ہے۔ بین الاقوامی قانون کے قانونی کردار سے انکار کرنے والوں میں جان آسٹن، ہابس، اور بینتھم سمیت بہت سے لوگ شامل تھے[۳۳]۔ بعض دوسرے ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ علم قانون کا ایک معدوم نقطہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کی قانونی طاقت بہت کمزور ہے۔ کچھ دوسرے کہتے ہیں کہ اسے محض مثبت بین الاقوامی اخلاقیات کی حیثیت حاصل ہے چنانچہ بعضوں نے کہا ہے کہ بین الاقوامی قانون سادہ طور پر اخلاقی اقدار کا ایک مجموعہ ہے۔

یہ اسکالر بین الاقوامی قانون کے قانونی کردار کا انکار بالعموم اس لیے کرتے ہیں کیونکہ:

۱) اس کے اصولوں کی تشکیل یا تخلیق کے لیے کوئی مسلمہ ادارہ نہیں ہے،

۲) ان اصولوں کے تحت تنازعات کے تصفیے کے لیے لازمی دائرہ اختیار کے ساتھ عدالتوں کا کوئی سلسلہ مراتب نہیں ہے، اور

۳) ان قوانین کے نفاذ کے لیے کوئی مسلمہ نظام نہیں ہے۔

اس لیے وکلاء اور ماہرین قانون کی ایک معقول تعداد پوچھتی ہے کہ ایک نظام قانون، نیز عدلیہ اور انتظامیہ کی عدم موجودگی میں ان اصولوں یا قواعد کو قانون کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟ اور بین الاقوامی قانون کا جواز کیا ہے جب کہ یہ دانتوں سے محروم ہے اور اپنے آپ کو نافذ کرنے یا اپنا دفاع کرنے کا

کوئی اختیار نہیں رکھتا؟

تاہم ماہرین کے دوسرے مکتب فکر کا موقف ہمیشہ یہ رہا ہے کہ بین الاقوامی قانون حقیقی معنوں میں قانون ہے۔

مسلمان قانون دانوں کی طرف سے یہ سوال کبھی نہیں اٹھایا گیا۔ان کے نزدیک مسلم بین الاقوامی قانون اتنا ہی بااختیار ہے جتنا اسلام کا شہری قانون ہے۔فی الحقیقت یہ دونوں قسم کے قوانین اپنا جواز قرآن سے اور اپنا اختیار رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے حاصل کرتے ہیں۔یہ اسلام کے ایسے دائمی ماخذ ہیں جنہیں مسلمان حکمراں اور عوام دونوں یکساں طور پر بااختیار اور واجب التعمیل کردار کا حامل سمجھتے ہیں۔اس لیے مسلمان ماہرین قانون یہ فیصلہ کرنے میں کبھی کسی مشکل سے دوچار نہیں ہوئے کہ کیا اسلام کا بین الاقوامی قانون، باقاعدہ قانون ہے اور کیا یہ اپنے لیے کسی الگ جواز کا حاجت مند نہیں ہے، ہم مسلم بین الاقوامی قانون کی ابتدائی دور کی کسی کتاب میں اس حوالے سے ایسی کوئی متنازع کیفیت نہیں پاتے۔

مغربی بین الاقوامی قانون مغربی اجتماعیّتوں کو یورپی یونین جیسے اتحادوں میں ڈھالنے کے لیے جس قسم کے ارتقائی عمل سے آج گزر رہا ہے، مسلم بین الاقوامی قانون مدتوں پہلے اس سے گزر چکا ہے۔جو نازک سوال وکلاء اور ماہرین قانون مختلف ملکوں بالخصوص مغربی یورپ میں اٹھاتے ہیں وہ یہ ہے کہ کیا یورپی یونین کو منظم کرنے والے قانون اور یورپی پارلیمنٹ کے اس اختیار نے جسے وہ استعمال کرتی ہے-یورپی قوموں کی اس خودمختاری کو جس کا ان کی جانب سے دعویٰ کیا جاتا ہے-سبوتاژ کر دیا ہے یا آگے چل کر اس کیفیت کے نتیجے میں وہ اپنی خودمختاری سے محروم ہونے والی ہیں؟ یہ بھی پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا نئی یورپی یونین ایک طرح سے سابقہ چرچ ریاست کا احیاء ہے؟ یہ سوال دونوں قسم کی ریاستوں کے درمیان مشترکہ شہریت، یکساں قانونی نظام، اور اس میں شمولیت کے لیے عیسائی ہونے کی پابندی جیسی نمایاں مماثلتوں کی بناء پر- جس کا مظاہرہ ترکی کی یورپی یونین میں شمولیت کے معاملے میں تحفظات کا اظہار کر کے کیا جارہا ہے- صورت حال سے متعلق بن گیا ہے۔

برطانوی پارلیمنٹ کے بارے میں پہلے ہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ یورپی پارلیمنٹ کے مقابلے میں اپنے اقتدار اور اختیارات سے دستبردار ہوگئی ہے یا کم از کم اس نے یورپی پارلیمنٹ کو اپنے اختیارات میں شریک کرلیا ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ نے اپنے مطلق اقتدار پر جس کا اس کی جانب سے دعویٰ کیا جاتا تھا، سمجھوتہ کرلیا ہے۔ پوری دنیا کے قانونی حلقوں میں یہ سوال زیر بحث ہے۔ برطانوی وکلاء کی طرف سے اس کے جو جوابات دیے گئے ہیں، ان میں اس حقیقت کے باوجود کہ وہ اپنے بعض اختیارات کی یورپی پارلیمنٹ کو منتقلی تسلیم کرچکی ہے، برطانوی پارلیمنٹ کی خودمختاری پر اصرار کیا گیا ہے۔

ایسے سوالات دوسری اور تیسری صدی ہجری کے مسلمان ماہرین قانون کے درمیان بھی اس وقت زیر بحث آئے جب دو یا زیادہ حکومتیں دارالاسلام کے مشترکہ قانون کے تحت، ایک ہی اسلامی علاقے کے حدود کے اندر وجود میں آئیں۔ ہم تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے دارالاسلام کو ایک حد تک موجودہ یورپی یونین کے مانند تصور کرسکتے ہیں، جہاں بڑی حد تک مشترکہ شہریت رائج کردی گئی ہے، اور جہاں بہت سے ایسے شعبے جو پہلے کسی ملک کے اپنے ہی لوگوں تک محدود تھے، انہیں اب، ملکوں کی اپنی شناخت اور کسی حد تک ان کی خودمختاری کی قیمت پر، دوسرے ملکوں کے شہریوں کے لیے بھی کھول دیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی دارالاسلام اور اس کے حدود میں واقع مختلف مسلم حکومتوں کے درمیان بھی، چند امتیازات کے ساتھ، تعلقات کی یہی شکل ہوا کرتی تھی۔

دوسری صدی ہجری میں مسلمان ماہرین قانون کے ہاتھوں پروان چڑھنے اور بعد کے دور کے فضلاء کی جانب سے توسیع پانے والے سیَر کے علم نے کچھ اور معاملات بھی چھیڑے جن پر اب بات کرنا زیادہ موزوں نہیں، تاہم اس زمانے میں یہ بہت برمحل تھے۔ ہر زندہ اور متحرک قانون کا یہی معاملہ ہے۔ ہر قانونی روایت میں نظر آتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، اس کے بعض اجزاء یا تو منسوخ، یا بدلتی ہوئی ضروریات کے سبب غیر متعلق ہوجاتے ہیں۔ جیسے جیسے وقت کے تقاضے تبدیل ہوتے ہیں، قانونی نظام کا داخلی میکانزم از کار رفتہ امور کو قانون کے بنیادی دھارے سے خارج

کرنے کا کام کرنے لگتا ہے۔ ابتدائی مسلم بین الاقوامی قانون کے بعض امور کے ضمن میں بھی ایسا ہی ہوا۔ مثال کے طور پر، جنگوں میں ہاتھ آنے والے مال غنیمت کی تقسیم سے متعلق سوالات نے مسلمان فضلاء کی تقریباً تمام ابتدائی تحریروں میں نمایاں جگہ پائی۔ اس کی وجہ بالعموم یہ تھی کہ ابتدائی صدیوں، خصوصاً پہلی دو یا تین صدیوں میں، مسلمانوں کے پاس باقاعدہ تنخواہ یافتہ افواج نہیں ہوا کرتی تھیں۔ مسلم افواج عموماً ان رضا کاروں پر مشتمل ہوتی تھیں جو فوج میں یا تو اپنے ملک کے دفاع کے لیے شامل ہوتے تھے یا جہاد میں حصہ لینے کی خاطر، تاکہ اللہ کی رضا حاصل کر سکیں جس کا قرآن میں بارہا وعدہ کیا گیا ہے۔

اس صورت حال میں، مسلمان ماہرین قانون کے لیے یہ معاملہ بہت اہم تھا کہ مجاہدین کے درمیان مال غنیمت کس طرح تقسیم کیا جانا چاہیے۔ تاہم جب مسلمان حکومتوں نے مختلف علاقوں میں باقاعدہ افواج رکھنے کا بندوبست کر لیا، تو اس معاملے کی اہمیت بڑی حد تک ختم ہو گئی۔

اس موضوع پر کی گئی ابتدائی کاوشوں میں ایسے اور بھی معاملات ملتے ہیں جو آج کے حالات سے متعلق نہیں ہیں لیکن ایسا وقت آ سکتا ہے جب وہ از سر نو اہمیت اختیار کر لیں۔

مسلم بین الاقوامی قانون کی متعدد خصوصیات اسے بین الاقوامی قوانین کے تصورات کی دوسری روایات سے ممتاز کرتی ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مسلم بین الاقوامی قانون ایک جامع نظام قانون کا لازمی حصہ ہے۔ یہ جامع قانونی اسکیم متوازن، ہمہ پہلو، ہمہ گیر، اور مسلمان فرد اور مسلمان معاشرے دونوں کی زندگی میں رونما ہونے والی تمام ممکنہ صورتوں کا لحاظ رکھنے والی ہے۔ یہ اسکیم انسانی سوچ، اخلاقی قدروں اور روحانی بنیادوں میں گہرائی تک اپنی جڑیں رکھتی ہے۔ اسلام کا قانونِ اقوام کبھی بھی اخلاقی تقاضوں سے عاری قانونی نظام نہیں رہا۔ اس نے ہمیشہ اپنا قانونی جواز اُن اخلاقی اصولوں سے اور اپنا اعتبار و اختیار، ان مذہبی بنیادوں سے اخذ کیا ہے جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں۔[۳۴]

اسلامی قانون بالکل شروع ہی سے کثیر النسلی اور کثیر الثقافتی قانونی نظام رہا ہے جو ایک تکثیری

معاشرے کے لیے ایک عملی اور قابل عمل نمونہ فراہم کرتا ہے۔ انسانی نسلوں اور قانونی آراء کے تنوع میں یہ ایک روحانی۔ اخلاقی یگانگت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ اسلام کی عمومی وحدت کے نقشہ کار میں مختلف لوگوں اور قوموں کے تنوع اور ثقافتی آزادی کو بھی برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اسلامی قانون کے دوسرے اجزاء کی طرح مسلم بین الاقوامی قانون بھی قرآن کے تصور عدل پر مبنی ہے، جو حقیقی عدل اور قانونی عدل میں امتیاز کرتا ہے۔ اس لیے پوری انسانی تاریخ میں شاید تنہا شریعت ہی وہ نظام قانون ہے جس نے ریاست، اس کے اعضاء اور مشینری کی جانب سے فراہم کیے جانے والے قانونی انصاف اور افراد کی جانب سے مہیا کیے گئے حقیقی انصاف کے درمیان خط امتیاز کھینچا ہے۔ ۳۵ اس کے ساتھ ساتھ یہ بین الاقوامی سودوں اور لین دین کی معاہداتی بنیادوں کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ ۳۶

قرآن ایسی آیات سے بھرا ہوا ہے جن میں وعدوں کو پورا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ وہ اہل ایمان سے وعدوں پر قائم رہنے اور یقین دہانیوں کو پورا کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ۳۷ ان قرآنی احکام کو رسول اللہ کی جانب سے ایک قانونی ضابطے کی شکل دی گئی، جس کی رو سے مسلمانوں کو ان شرائط کی لازماً پابندی کرنی چاہیے جو باہمی اتفاق سے طے پا جائیں۔ ۳۸ اس بنیادی قانونی ضابطے کی روشنی میں مسلمان فقہاء نے دوسرے اصول وضع کیے ہیں، جنہیں اب دنیا کی مختلف قانونی روایات میں تسلیم کیا جاتا ہے، اور جو انسانی برادری کے تمام نظام ہائے قانون میں شامل کیے جا چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ۳۹ یہ اصول کہ (مفہوم) ''سفیر کی جانب سے عہد شکنی، ریاست کی جانب سے عہد شکنی سمجھی جائے گی۔'' ۴۰ اس لیے ریاست کو بحیثیت سفیر بھیجے جانے والے شخص کے قول و عمل کی اس وقت تک مکمل ذمہ داری قبول کرنی چاہیے جب تک وہ اپنے منصب پر کام کرتا رہے۔

بین الاقوامی تعلقات کو مضبوط اخلاقی بنیادوں پر منظم کرنے کے لیے مسلم بین الاقوامی قانون کے اس فیاضانہ حصے، اور اس موضوع پر مسلمان فضلاء کی جانب سے دوسری صدی ہجری سے تخلیق کیے گئے ٹھوس لٹریچر کے باوجود، یہ حقیقت افسوس ناک ہے کہ اگر سب نہیں تو بیشتر ممتاز مغربی اسکالر اس ورثے کا اعتراف کرنے میں قطعی ناکام رہے ہیں۔

اوپن ہیم کی بنیادی اہمیت کی کاوش ''اے ٹریٹیز آف انٹرنیشنل لاء'' سے میں بہت متاثر رہا ہوں اور اس کا مطالعہ دور طالب علمی ہی سے بڑے غور وفکر اور احترام کے ساتھ کرتا رہا ہوں۔ مصنف کی علمیت اور کتاب کی جامعیت میرے لیے انتہائی متاثر کن ثابت ہوئی۔ لیکن مجھے یہ جان کر شدید مایوسی ہوئی کہ اس فاضل دانشور نے بھی بین الاقوامی قانون کے لیے مسلمانوں کے حصے کو نظر انداز کرنے کی راہ کا انتخاب کیا ہے۔ بین الاقوامی قانون کی بنیادوں پر بات کرتے ہوئے اوپن ہیم یونانی تاریخ کا حوالہ دیتا ہے اور پھر رومیوں کی بات کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ ایک ہزار سال سے زیادہ لمبی چھلانگ لگاتا ہے اور جدید مغربی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اس نے مسلمان ماہرین قانون کے کام کا ذکر کرنے کے لیے ایک سطر لکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی ہے، اگرچہ ان کی تحریریں اسے امکانی طور پر جرمن، رومن اور فرنچ تراجم کی شکل میں دستیاب تھیں۔ مواد کی اس دستیابی کے باوجود، اس نے بین الاقوامی قانون کے لیے مسلمانوں کی خدمات کے بارے میں کسی سرسری تبصرے سے بھی گریز کا فیصلہ کیا۔ ایک ہزار سال کی طویل مدت کے حوالے سے۔ جس میں اس کے بقول بین الاقوامی قانون میں کوئی ارتقاء نہیں ہوا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس عرصے میں اس ارتقاء کی نہ کوئی گنجائش تھی نہ ضرورت۔[۴۱] اس طرح وہ ایک فقرے میں بین الاقوامی قانون کی تشکیل میں ایک ہزار سال کے خلاء کا جواز پیش کرتا ہے۔

ان تفصیلات سے واضح ہے کہ بین الاقوامی قانون میں مسلمان فقہاء کا حصہ، اپنے دور کے لحاظ سے نہ صرف انتہائی ترقی یافتہ اور اعلیٰ درجے کا تھا بلکہ آج بھی مزید ارتقاء کے لیے ایک ماخذ اور بنیاد کی حیثیت سے موزوں اور برمحل ہے۔ فی الحقیقت، مسلمانوں کے ہاتھوں ایک ہزار سال سے بھی زیادہ مدت پہلے پروان چڑھنے والا بین الاقوامی قانون، اپنے بہت سے کلیدی اصولوں میں، عصر حاضر کے بیان کردہ تحمل و رواداری اور منصفانہ بین الاقوامی معاشرے کے مثالی معیارات کے حصول کے حوالے سے [مغربی قانون کی نسبت] زیادہ قریب تر اور زیادہ قابل عمل ہے۔ لہٰذا اس قیمتی ورثے کی بحالی، صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ تمام معاشروں کے علمائے قانون کے لیے لازمی ہے۔

مسلمان، بالخصوص مسلم دنیا کے قانون کے طلبہ، اپنے مغربی دوستوں کو یہ یاد دلانا پسند کریں گے

کہ بین الاقوامی معاملات کے قانون کی توسیع اور ایک نئے قانونی فکر کے ارتقاء میں، ثقافتی پس منظر، سماجی اطوار، اخلاقی معیارات، اور مذہبی اعتقادات اور جذبات کا لحاظ رکھا جانا چاہیے جس سے عالمی اجتماعیت کی صورت گری ہوتی ہے۔ ایک قانون ان لوگوں کے جذبات اور مثالی معیارات کو نظر انداز نہیں کر سکتا جن پر اسے نافذ کیا جانا ہو۔ ایسا قانون زندہ نہیں رہ سکتا جو زمینی حقائق کو ملحوظ نہ رکھے یا ان کا جواب مہیا نہ کرے۔ اور زمینی حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی ایک چوتھائی سے زیادہ آبادی ایک منفرد ثقافت، مثالی معیارات کا ایک مجموعہ اور جذبات رکھتی ہے۔ اس لیے کسی بھی ایسے نظام قانون کو جو اپنے اطلاق میں آفاقی ہونا چاہتا ہو، اسے لازمی طور پر ایک چوتھائی انسانی آبادی کے مثالی معیارات اور جذبات کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ بین الاقوامی عدالت کا منشور، عدالت سے مطالبہ کرتا ہے کہ محض مغربی نہیں بلکہ تمام قانونی روایات کے ذمہ دار اور اہم ماہرین قانون کی تحریروں کو ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔ کسی سوال کا فیصلہ کرنے سے پہلے وہ سب کچھ جو دوسری نمایاں انسانی روایات اور تہذیبوں میں قانونی موضوعات پر لکھا گیا ہے، لازماً نگاہ میں رکھا جانا چاہیے۔ کچھ اور نہیں تو اسے مسلم بین الاقوامی قانون کے بارے میں نئی سوچ کے جواز کے لیے کافی ہونا چاہیے۔

اسلام اور مسلمان ماہرین قانون کا کام ایک ہزار برس کی وہ گم شدہ کڑی فراہم کرتا ہے جسے مغربی علمائے قانون کی جانب سے یا تو مواد کی عدم دستیابی یا کسی دوسری سوچ کی بناء پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بہر حال اب اہم کاوشوں کے تراجم کے ذریعے تمام ممتاز مغربی زبانوں میں یہ مواد دستیاب ہے۔ اب عالمی اسکالرز کے لیے انسانی تاریخ کے اگر ہزاروں نہیں تو کم از کم سینکڑوں بہترین قانونی دماغوں کے اس کام کو نظر انداز کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا ہے۔

حواشی.....

۱: مختلف اسکالرز نے قانون کے مثبت نظریے کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی تشریح کی ہے۔ بین الاقوامی قانون سے اس کے تعلق کو جاننے کے لیے دیکھیے:

Starke, "Introduction to International Law", 20-24

۲: قدیم ہندوستانی فلسفیوں کے نظریات کے لیے دیکھیے:

Kapoor and Tandan, "International Law".

۳: دوسری کاوشوں کے ساتھ دیکھیے:

Nussbaum, "Concise History of the Law of Nations".

۴: جُس جینٹیم (jus gentium)، یعنی قانونِ اقوام، رومی قانون کی ایک اصطلاح تھی۔ یہ جدید مفہوم میں بین الاقوامی قانون کے مساوی نہیں ہے۔ اس کے بجائے اس کا مطلب ہے شہری قانون کے برعکس، یعنی وہ قوانین جو قدیم زمانے کی مہذب قوموں کی جانب سے تسلیم کیے گئے۔ باقاعدہ بین الاقوامی قانون کی عدم موجودگی میں بین الاقوامی معاملات میں جُس جینٹیم پر انحصار کیا جاتا تھا۔

۵: اوپن ھیم (Oppenheim)، ۲۰۰۸، ص ۸۷: ''...اپنی ابتداء ہی سے جدید بین الاقوامی قانون اس تقاضے سے مغلوب رہا کہ اسے بڑی حد تک مغربی یورپی عیسائی تہذیب کی ضروریات کی تکمیل کرنی ہے---''

۶: حمید اللہ، ''قانون بین الممالک کے اصول اور نظائر''، ص ۳۰۔

۷: بحوالہ حمید اللہ، ایضاً

on the authority of Nys, "Les Origines du Droit Internaional".

۸: بین الاقوامی قانون میں فرد کو بحیثیت موضوع تسلیم کیے جانے پر مختصر بحث کے لیے دیکھیے:

Levy, "Contemprary International Law", 72-74

۹: ایضاً، ص۶۹-۷۰

۱۰: ایضاً

۱۱: دیکھیے Dixon, "Textbook on International Law", 32

۱۲: مثال کے لیے دیکھیے:

Joshi, "International Law and Human Rights", 304-372

۱۳: دیکھیے PCIJ Sev. A. 9 (1927): 4-33 ff

۱۴: ڈکسن، ایضاً، ص۳۲۵

۱۵: بین الاقوامی انسان دوست قانون متعدد بین الاقوامی معاہدوں اور میثاقوں کے ذریعے بتدریج ارتقاء پذیر ہوا ہے، ان میں اب تک سب سے آخری جنیوا کنونشن اور ھیگ کنونشن ہے، جن پر انیسویں اور بیسویں صدی میں دستخط ہوئے۔ یہ پورا قانون اب ۱۲ اگست ۱۹۴۹ء کے چار بخوبی معروف جنیوا کنونشنز میں موجود ہے۔

۱۶: مثال کے طور پر دیکھئے، القرآن، البقرہ ۲:۲۱، النساء ۴:۱، الحجرات ۴۹:۱۳، وغیرہ۔

۱۷: مثال کے طور پر دیکھئے، القرآن، الاعراف ۷:۲۶، ۲۷، ۳۵، وغیرہ۔

۱۸: عیسائیوں کی بعض اچھی صفات کے حوالے کے لیے دیکھیے، القرآن، المائدہ ۵:۸۲-۸۳۔

۱۹: ترمذی، الجامی، کتاب العلم، ۱۹؛ ابن ماجہ، السنن، کتاب الزہد، ۱۵۔

۲۰: اس اتحاد کی تفصیلات دوسروں کے ساتھ ساتھ ابن ہشام نے بھی اپنی سیرت النبیؐ میں محفوظ کی ہیں۔

۲۱: دیکھیے: اسٹارک، انٹروڈکشن ٹو انٹرنیشنل لاء۔

۲۲: ''اہل کتاب'' ایک اصطلاح ہے جو قرآن میں ان لوگوں کی نشان دہی کے لیے بکثرت استعمال کی گئی ہے جو کسی آسمانی کتاب یا کسی ایسے مذہب کے حامل ہیں جو فی الاصل آسمانی ہے۔ خاص طور پر یہ یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے مستعمل ہے۔

۲۳: القرآن ۳:۶۴

۲۴: حمید اللہ، مسلم کنڈکٹ آف اسٹیٹ، ص ۱۴

۲۵: مثال کے طور پر دیکھیے: القرآن، البقرہ ۲:۶۲، المائدہ ۵:۶۹، الحج ۲۲:۱۷۔

۲۶: مثال کے طور پر دیکھئے، القرآن، التوبہ ۹:۴-۵، ۷؛ النساء ۴:۹۰، ۹۱؛ وغیرہ

۲۷: اسی مقصد کے لیے اسلام کے دور اول کے علماء کی جانب سے سیر اور مغازی کا علم پروان چڑھایا اور منضبط کیا گیا تھا۔ موازنے کے لیے دیکھیے: حمید اللہ، ایضاً، باب دوم۔

۲۸: دیکھیے:

Ghazi, "Introduction to al-Shaibani's al-Siyar al-Saghir, 7-17

۲۹: ایسی بعض تفصیلات کے لیے دیکھیے: غازی، خطبات بھاولپور، ۱۵۴-۱۶۳۔

۳۰: عریبک، ایم ایس، نمبر۔ ۱۱۵۶، لالے لی کلیکشن۔

۳۱: جدید بین الاقوامی انسانیت دوست قانون بھی اسی مقدمے پر مبنی ہے کہ اس کا اصل مقصد جنگ کے متاثرین کا تحفظ ہے۔

۳۲: تفصیلات کے لیے دیکھیے:

Zemmali, *Combattants et Prisonnier de Guerre en Droit Islamique et en Droit International Humanitaire*

۳۳: دیکھیے Starke, "Introduction to International Law", 18 ff

۳۴: تفصیلی مباحث کے لیے دیکھیے: حمید اللہ، ایضاً، ۷۴-۷۶۔

۳۵: غازی، *State and Lagislation in Islam*, 92-94

۳۶: اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ قرآن ذمہ داریوں اور وعدوں کی تکمیل پر زور دیتا ہے، مثال کے طور پر، القرآن، الانفال، ۸:۵۵-۵۶؛ التوبہ ۹:۴، ۷؛ وغیرہ۔

۳۷: القرآن، الانفال ۸:۵۵-۵۶، التوبہ ۹:۴؛ وغیرہ۔